علامہ اقبالؒ ــــ شخصیت اور کارنامہ

سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ

(۱)

سب جانتے ہیں کہ اقبال نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہی تاریخ' یہی ادب' یہی اقتصادیات' یہی سیاسیات' یہی قانون اور یہی فلسفہ انہوں نے بھی پڑھا تھا اور ان فنون میں بھی وہ مبتدی نہ تھے بلکہ منتہی فارغ التحصیل تھے۔ خصوصاً" فلسفہ میں تو ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا جس کا اعتراف موجودہ دور کے اکابر فلاسفر تک کر چکے ہیں۔ جس شراب کے دو چار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہکنے لگتے ہیں یہ مرحوم اس کے سمندر پئے بیٹھا تھا۔ پھر مغرب اور اس کی تہذیب کو بھی اس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا' جس طرح ہمارے ۹۹ فیصدی نوجوان دیکھتے ہیں بلکہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر تہ تک اتر چکا تھا' اور ان سب مرحلوں سے گزرا تھا جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں نوجوان اپنے دین و ایمان' اپنے اصول تہذیب و تمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی قومی زبان تک بولنے کے قابل نہیں رہتے۔

لیکن اس کے باوجود اس شخص کا حال کیسا تھا؟ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا' اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی ہی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ جو کچھ دیکھتا تھا' قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شے واحد تھے' اور اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس کے دور کے علمائے دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی

القرآن میں اس امامِ فلسفہ اور اس ایم اے پی ایچ ڈی بار ایٹ لاء سے لگا کھاتا ہو۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آخری دور میں اقبال نے تمام کتابوں کو الگ کر دیا تھا اور سوائے قرآن کے ' اور کوئی کتاب وہ اپنے سامنے نہ رکھتے تھے ۔ سالہا سال تک علوم و فنون کے دفتروں میں غرق رہنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے تھے ' وہ یہ تھا کہ اصل علم قرآن ہے اور یہ جس کے ہاتھ آجائے وہ دنیا کی تمام کتابوں سے بے نیاز ہے ۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان کے پاس فلسفہ کے چند اہم سوالات بھیجے ' اور ان کا جواب مانگا ۔ ان کے قریب رہنے والے لوگ متوقع تھے ' کہ اب علامہ اپنی لائبریری کی الماری کھلوائیں گے ۔ اور بڑی بڑی کتابیں نکلوا کر ان مسائل کا حل تلاش کریں گے ' مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے ۔ کہ لائبریری کی الماریاں مقفل کی مقفل رہیں ' اور وہ صرف قرآن ہاتھ میں لے کر جواب لکھنے بیٹھ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے ' مگر یہ شائد کسی کو نہیں معلوم کہ انہوں نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربی کے قدموں میں ایک متاع حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا ۔ حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں ۔ اور پہلو بدل بدل کر تاویلیں کرنے لگتے ہیں ۔ یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا ۔ اور ایسی کوئی حدیث سن کر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا ۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب ثلاثہ کے ساتھ کوہ احد پر تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں احد لرزنے لگا ' اور حضورؐ نے فرمایا کہ ٹھہر جا تیرے اوپر ایک نبی ' ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے ۔ اس پر پہاڑ ساکن ہو گیا۔

اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے ؟ میں اس کو استعارہ و مجاز نہیں بالکل ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں ' اور میرے نزدیک اس کے لیے کسی تاویل کی حاجت نہیں ' اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے آکر مادے کے بڑے سے بڑے تودے بھی لرز اٹھتے ہیں ' مجازی طور پر نہیں واقعی لرز اٹھتے ہیں۔

اسلامی شریعت کے جن احکام کو بہت سے روشن خیال حضرات فرسودہ اور بوسیدہ قوانین سمجھتے ہیں ۔ اور جن پر اعتقاد رکھنا ان کے نزدیک ایسی تاریک خیالی ہے ۔ کہ مہذب سوسائٹی میں ان کی تائید کرنا ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لیے ڈوب مرنے سے زیادہ بدتر ہے ۔ اقبال نہ

صرف ان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا تھا بلکہ برملا ان کی حمایت کرتا تھا ۔ اور اس کو کسی کے سامنے ان کی تائید کرنے میں باک نہ تھا ۔ ان کی ایک معمولی مثال سن لیجئے ۔ ایک مرتبہ حکومت ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا ۔ اور یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ پیش کیا ' مگر شرط یہ تھی ۔ کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کرائیں گے ۔ اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے ۔ اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا ' اور خود لارڈ و لنگڈن کو کہا کہ میں بے شک ایک گناہ گار آدمی ہوں احکام اسلامی کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوتی ہیں ' مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا ۔ کہ محض آپ کا عہدہ حاصل کرنے کے لیے شریعت کے حکم کو توڑ دوں ۔

اقبال کے متعلق عام خیال یہ ہے ۔ کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے ۔ عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا ۔ اس بدگمانی پیدا کرنے میں خود ان کی افتاد طبیعت کا بھی بہت کچھ دخل ہے ۔ ان میں کچھ فرقہ ملامتیہ کے سے میلانات تھے ' جن کی بناء پر اپنی رندی کے اشتہار دینے میں انھیں کچھ مزا آتا تھا ۔ ورنہ در حقیقت وہ اتنے بے عمل نہ تھے ۔

قرآن مجید کی تلاوت سے ان کو خاص شغف تھا ۔ اور صبح کے وقت بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے ۔ مگر اخیر زمانے میں طبیعت کی رقت کا یہ حال ہو گیا تھا ۔ کہ تلاوت کے دوران میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں ۔ اور مسلسل پڑھ ہی نہ سکتے تھے ۔ نماز بھی بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے ۔ مگر چھپ کر ۔ ظاہر میں یہی اعلان تھا ۔ کو نرا گفتار کا غازی ہوں ۔

ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے حالات ان کی وفات ہی کے بعد لوگوں میں شائع ہوئے ۔ ورنہ عام خیال یہی تھا ۔ کہ جیسے اور "سر صاحبان" ہوتے ہیں ۔ ویسے ہی وہ بھی ہوں گے ' اور اسی بناء پر بہت سے لوگوں نے یہاں تک بلا تحقیق لکھ ڈالا تھا ۔ کہ ان کی بارگاہ عالی تک رسائی کہاں ہوتی ہے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ محض حقیقت میں اس سے بھی زیادہ فقیر منش تھا ۔ جتنا اس کی وفات کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بیان کیا ہے ۔ ایک مرتبہ کا واقعہ سن لیجئے ۔ جس سے اس نائٹ اور بیرسٹر کی طبیعت کا آپ اندازہ کر سکیں گے ۔ پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لیے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون داں اصحاب کو اپنے ہاں بلایا ۔ اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا ۔ رات کو جس وقت اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے گئے ۔ تو ہر طرف عیش و تنعم

کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پاکر معاً“ ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاکؐ کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں ۔ اس نے بوریے پر سو سو کر زندگی گزاری تھی ۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی ۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اٹھے اور برابر کے غسل خانہ میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے ۔ اور مسلسل رونا شروع کر دیا ۔ جب دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے غسل خانہ ہی میں سوتے رہے۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے ۔ جب باہر کی دنیا ان کو سوٹ بوٹ میں دیکھا کرتی تھی ۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سوٹ کے اندر جو شخص چھپا ہوا ہے ۔ اس کی اصلی شخصیت کیا ہے ؟ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا۔ کہ جو سیاسی اغراض کے لیے سادگی و فقر کا اشتہار دیتے ہیں ' اور سوشلسٹ بن کر غریبوں کی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں ' مگر پبلک کی نگاہوں سے ہٹ کر ان کی تمام زندگی رئیسانہ اور عیش پسندانہ ہے۔

(۲)

۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا نازک ترین زمانہ تھا ۔ اس وقت مسلمانوں نے تحریکِ خلافت میں اپنی تمام تر پونجی لگا دی تھی۔ ان کو یہ احساس تھا کہ خلافت اسلامیہ کو بچانے کے لیے اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کو اغیار کے قبضہ سے چھڑانے کے لیے جو کچھ ہم سے ہو سکتا ہے وہ ہمیں کر گزرنا چاہیے ۔ اس غرض کے لیے انہوں نے نہ اپنا مال خرچ کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی اور نہ اپنی جانیں قربان کرنے میں کوئی دریغ کیا ۔ وہ اس مقصد کے لیے اس حد تک گئے کہ جن ہندوؤں کے متعلق ان کو صدیوں سے تجربہ تھا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کیا جذبات رکھتے ہیں انہوں نے ان کے ساتھ بھی محض اس امید پر اتحاد و تعاون کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی کہ کسی طرح سے ہم خلافت کے ادارے کو بچا لے جائیں اور اپنے مقامات مقدسہ کو اغیار کے قبضہ سے چھڑالیں۔ لیکن آخر کار اس ساری تگ و دو کا جو انجام ہوا وہ یہ تھا کہ جس خلافت کو بچانے کے لیے انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی اس کی بساط انہی لوگوں نے لپیٹ دی جن کی خلافت کے لیے مسلمان کوشش کر رہے تھے اور جن مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے وہ اپنی جان لڑا رہے تھے انہی مقاماتِ مقدسہ کے

رہنے والے قومیت کے بت کے پرستار بن گئے اور انہوں نے آپس میں کشت و خون شروع کر دیا۔ آپس میں عداوتوں اور لڑائیوں پر اتر آئے اور وہ خود ہی مقامات مقدسہ پر اغیار کے مستقل قبضے اور تسلط کا ذریعہ بن گئے۔ ایک طرف تو ہندی مسلمانوں کو خلافت کے تحفظ کے سلسلے میں اپنی ساری کوششوں کا یہ نتیجہ دیکھنا نصیب ہوا اور دوسری طرف جس کانگریس کے ساتھ انہوں نے اتحاد اور جن ہندوؤں کے ساتھ انہوں نے تعاون کیا تھا وہی ان پر ٹوٹ پڑے اور ۱۹۲۴ء سے ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سارے عرصے میں کانگریس کے لیڈروں کو ان لوگوں کی مذمت کرنے کی کبھی ہمت نہ ہوئی جو مسلمانوں کے ساتھ یہ مظالم کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔ گویا مسلمانوں کو اس موقع پر دوہری شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک طرف جس مقصد کے لیے جان لڑائی تھی وہ مقصد فوت ہو گیا اور دوسری طرف جن لوگوں سے اتحاد کیا تھا وہ مسلمانوں سے لڑنے اور ان کو تباہ کرنے کے درپے ہو گئے۔ سب سے زیادہ انہوں نے گاندھی جی پر اعتماد کیا تھا اور انھیں اپنا لیڈر بنایا تھا مگر خود انہی کو کبھی اس بات کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس مرحلے پر مسلمانوں پر ہندوؤں کی زیادتیوں کے خلاف زبان کھولتے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں پر یکایک ایک سخت مایوسی طاری ہو گئی اور ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ میں اس زمانے میں ہونے والے ان سارے حالات کا شاہد ہوں اور بکثرت ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے سامنے یہ ساری تاریخ گزری ہے کہ کس طرح مسلمان ایک شدید مایوسی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ اس کے ساتھ اس ساری لیڈر شپ سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ گیا جنہوں نے تحریک خلافت اٹھائی تھی اور اس میں کانگریس کے ساتھ اتحاد کیا تھا۔ اس طرح مسلمان مایوس بھی ہو گئے اور بے قیادت بھی رہ گئے۔ پوری قوم میں ایک ہمہ گیر اور شدید انتشار کی کیفیت رونما ہو گئی۔ اس انتشار کی حالت میں مسلمان اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے تھے کہ غیر مسلم ایک لیڈر کی لیڈر شپ میں پوری طرح سے متحد ہیں اور ہندوستان پر اپنے قبضے کو مکمل کرنے کے لیے ہر ممکن جدو جہد میں مصروف ہیں اور دوسری طرف مسلمان بالکل اس قابل نہیں تھے کہ اس صورت حال کا مقابلہ کر سکیں اور اپنے تحفظ کی کوئی تدبیر اختیار کر سکیں۔

ایک طرف تو یہ مصیبت تھی اور دوسری طرف عین اسی زمانے میں یہ فتنہ رونما ہوا کہ مسلمانوں کے اندر الحاد و دہریت کی تحریکیں اٹھنی شروع ہوئیں اور اسلام کی حقانیت پر کھلم کھلا حملے کیے جانے لگے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کبھی اس طرح علانیہ الحاد و دہریت کی دعوت نہیں اٹھی تھی جس طرح کی اس زمانے میں اٹھی۔ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں کیمونزم کی

اشاعت شروع ہو گئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پورے پورے رسائل و جرائد اس غرض کے لیے نکلنے شروع ہو گئے کہ مسلمانوں میں الحاد و دہریت کی تبلیغ کریں ۔ اخلاقی بے قیدی کی تعلیم مسلمانوں کو دی جانے لگی اور کھلم کھلا دی جانے لگی ۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم لگی کہ کوئی شخص پڑھا لکھا بھی ہو اور وہ خدا کو بھی مانتا ہو اور نماز روزہ جیسے احکام کی پیروی بھی کرتا ہو ۔ اندازِ نظر اس حد تک بدلا کہ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ جو شخص نماز پڑھ رہا ہے اس کو اپنی حرکت پر شرمانا چاہیے ' جو نہیں پڑھ رہا ہے اس کو شرمانے کی ضرورت نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ ایک طرف تو مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی و نظریاتی اختلال کا یہ عالم تھا اور اس کے ساتھ جس مصیبت میں وہ گرفتار تھے وہ یہ تھی کہ ان کی کوئی قابل اعتماد قیادت اس وقت موجود نہیں تھی ۔ جن لوگوں نے جنگِ عظیم اول سے پہلے اور جنگ کے زمانے میں ' جس حد تک بھی ہو سکا تھا اسلام کے علم کو بلند رکھا تھا وہ یا تو خاموش ہو چکے تھے ' یا مسلمانوں کے اندر ان کے اثر و نفوذ کو نقصان پہنچ چکا تھا ' یا انہوں نے اسلام کی دعوت کا راستہ چھوڑ کر قومیت اور وطنیت کی دعوت کا راستہ اختیار کر لیا تھا ۔۔۔۔۔۔۔ اس عالم میں صرف اقبال وہ شخص تھا جس نے اس پوری صورت حال کا مقابلہ کیا اور واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک چودہ سال کی مدت میں اسلامی تحریک اور اسلامی جذبے کے احیاء کے لیے اور مسلمانوں میں اسلامی اور ملی شعور کو ابھارنے اور بیدار رکھنے کے لیے اگر کوئی سب سے بڑی طاقت کام کر رہی تھی تو وہ اکیلے اقبالؒ کی طاقت تھی ۔ جو لوگ بھی کلام اقبال پر نگاہ رکھتے ہیں اور انہوں نے ان کی نظم و نثر پڑھی ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ اقبال نے ہندی مسلمانوں کے گرتے ہوئے وقار کو بچانے اور انہیں اپنے مٹتے ہوئے ملی تشخص کو بچانے کے لیے کس طرح آمادۂ کار کیا اور اس غرض کے لیے انہوں نے نظم و نثر دونوں کی قوت سے کام لیا۔

اقبال کے کارنامے کو ہم مختلف عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں۔

مغربی تہذیب پر ضرب کاری

سب سے اہم کام جو اقبال نے انجام دیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے مغربیت اور مغربی مادہ پرستی پر پوری قوت کے ساتھ ضرب لگائی ۔ اگرچہ یہ کام اس وقت علمائے دین اور اہلِ مدارس اور خطیب حضرات بھی انجام دے رہے تھے مگر ان کی باتوں کو یہ کہہ کہ نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور کیا جا سکتا تھا کہ یہ لوگ مغربی فلسفہ اور مغربی تہذیب و تمدن سے واقفیت نہیں رکھتے تھے

-------- ان کے برعکس اقبالؒ وہ شخص تھا کہ وہ ان سے زیادہ مغرب کو جانتا تھا۔ اور ان سے زیادہ مغرب کے فلسفے اور مغربی علوم سے واقف تھا اس لیے جب اقبال نے مغربیت ' مغربی مادہ پرستی ' مغربی فلسفے اور مغربی افکار پر چوٹ لگائی تو مسلمانوں پر مغرب کی جو مرعوبیت طاری تھی وہ کافور ہونے لگی اور واقعہ یہ ہے کہ اس مرعوبیت کو توڑنے میں اکیلے اقبال کا کارنامہ سب سے بڑھ کر ہے۔

اگرچہ علامہ اقبال نے مسلمانوں کی جسمانی غلامی توڑنے کے لیے بھی کوشش کی اور ان کو آزادی کا سبق دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کا ذہن اگر غلام ہو تو خواہ اس کا جسم آزاد بھی ہو جائے تب بھی وہ قوم آزاد نہیں رہ سکتی۔ اس وجہ سے اقبال نے مسلمانوں کی اس ذہنی غلامی کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی جو ان پر طاری ہو گئی تھی -------- اقبال کا خودی کا فلسفہ ' جس کے متعلق لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی چیستان یا معمہ ہے ' یہ درحقیقت اس بات کے لیے تھا کہ مسلمان اپنے آپ کو پہچانیں کہ وہ کیا ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو بھول گئے تھے ان کو اپنی تاریخ سے شرم آتی تھی ' وہ اپنی روایات ' اپنی تہذیب ' اپنے عقیدے اور اپنی اخلاقی اقدار کے بارے میں شدید احساس کمتری کا شکار ہو چکے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر دنیا کی تاریخ میں کوئی قابل قدر چیز ہے تو وہ صرف اہل مغرب کی پیش کی ہوئی ہے۔ یہ صورت حال اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان کا اپنا سرمایہ کیا ہے۔ اس موقع پر اقبال مرحوم نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ تم دنیا بھر میں سب سے زیادہ قابل فخر تہذیب رکھتے ہو۔ تمہارے پاس دنیا کا بہترین نظام حیات ہے اور تم سب سے زیادہ صحیح اور اعلیٰ اخلاقی اقدار رکھتے ہو۔ اپنی خودی کو پہچانو اور اپنے آپ کو جانو کہ تم کیا ہو۔ تم نے اپنے کو کھو دیا ہے۔ اور اپنی حقیقت کو گم کر دیا ہے۔ اپنے قومی تشخص کو سمجھو اور اپنی تہذیبی سربلندی کے لیے سرگرم عمل ہو جاؤ۔

اس کے ساتھ اقبال نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ اسلام کوئی پرانا اور از کارِ رفتہ نظام نہیں ہے جو اس زمانے میں کام نہ کر سکتا ہو۔ انہوں نے اپنے شعر سے بھی اور اپنی نثر سے بھی یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کی کہ اسلام ازلی اور ابدی اصولوں کا حامل ہے۔ اسلام کسی وقت بھی پرانا نہیں ہو سکتا۔ اس کے اصول ہر زمانے میں یکساں قابل عمل ہیں۔ اگرچہ اسلام کی حقانیت کی شہادت اس وقت علمائے دین منبروں پر بھی دے رہے تھے اور مدرسوں میں بھی ' لیکن جب اس مغربی تہذیب کی آغوش میں پرورش پائے ہوئے اور مغربی فلسفے پر عبور

رکھنے والے آدمی نے اٹھ کر اسلام کی حقانیت کی شہادت دی تو مسلمانوں کے قلوب و اذہان پر اس کا نہایت گہرا اور پائیدار اثر پڑا۔ اس وقت مختلف فتنوں کی یلغار کے درمیان مسلمانوں کی جو نسل گمراہ ہو رہی تھی اس کو بچانے کے لیے اہلِ منبر وہ کام نہیں کر سکتے تھے جو مغربی تعلیم یافتہ اور مغربی علوم میں مہارت کاملہ رکھنے والا یہ آدمی انجام دے سکتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ جب اس نے ایک باوقار، پر اعتماد اور مجتہدانہ شان کے ساتھ اسلام کی حقانیت کی شہادت دی تو نئی نسل کے اندر ایک نیا اسلامی شعور پیدا ہوا۔

وطنی قومیت کی تردید

اس کے ساتھ علامہ اقبال نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا وہ یہ ہے کہ انھوں نے وطنی قومیت اور قوم پرستی پر ایک شدید ضرب لگائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انھوں نے قوم پرستی نیشنلزم اور وطنی قومیت پر بروقت ضرب کاری نہ لگائی ہوتی تو آگے چل کر مسلمانوں کو کانگرس میں جذب کرنے کے لیے جو تحریک اٹھی تھی اس سے مسلمانوں کا بچ جانا محال تھا ------ ایسے حالات میں کہ جب علمائے دین تک اٹھ کر مسلمانوں کو وطنی قومیت کا درس دینے لگے تھے اور مسلمانوں کے بڑے بڑے متقی علما تک مسلمانوں سے یہ کہنے لگے تھے کہ وطنی قومیت سے تمھارے دین کو کوئی خطرہ نہیں۔ اس موقع پر یہ صرف اقبال تھا جس نے پوری شدت کے ساتھ اس تباہ کن تصور کا تار و پود بکھیرا، اور لوگوں کو پوری قوت کے ساتھ یہ بتایا کہ وطن بھی ایک بت ہے اور وطن کی پرستش کرنا بھی ویسا ہی شرک ہے جیسا کہ کسی بت کی پرستش کرنا شرک ہے۔ اگر اقبال نے یہ تعلیم بروقت نہ دی ہوتی تو بعد میں کانگرس نے رابطہ عوام (Mass Contact) کی جو تحریک شروع کی تھی اور جس میں علماء اور اشتراکی حضرات بھی شریک تھے، وہ تحریک مسلمانوں کو ہندوؤں کے اندر اس طرح گھلا دیتی جیسے کہ نمک پانی کے اندر گھل جاتا ہے۔ لیکن اقبال نے مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ قومیت، وطن اور زبان سے نہیں بنتی ہے بلکہ قومیت دین اور عقیدے سے بنتی ہے۔ اس نے مسلمانوں میں اس شعور کو بیدار کیا کہ تم ایک عقیدہ اور ایک تہذیب رکھنے والی قوم ہو، تمھاری قومیت ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے جن کی تہذیب اور عقیدہ و مسلک تم سے الگ ہے۔

وحدتِ ملّی کا احساس

اس کے ساتھ اقبال نے مسلمانوں کے اندر یہ احساس بھی ابھارا کہ تمام دنیا میں ملّت

اسلامیہ ایک وحدت ہے اور اس کو ایک وحدت ہونا چاہیے ——— اس طرح انہوں نے بیک وقت دو کام کیے ——— باہر کی دنیا میں مسلمان جس طرح قوم پرستی میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے سے کٹ رہے تھے اور ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے۔ اور جس طرح ترکوں اور عربوں کے درمیان ایک المناک کشمکش برپا ہوئی اور اس کے نتیجے میں شرق اوسط پر جو تباہی آئی اور تمام ممالک اسلامیہ جس مصیبت میں مبتلا ہوئے وہ سب اس قوم پرستی کا نتیجہ تھا۔ جس کی تبلیغ و اشاعت عیسائیوں نے عربوں اور ترکوں کے درمیان کی تھی ——— ایک طرف تو اقبال نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دی کہ تم ایک ملّتِ واحدہ ہو اور جس قوم پرستی میں تم مبتلا ہو یہ ایک بالکل غلط اور مہلک تصور ہے اور دوسری طرف انہوں نے ہندی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ تم مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک قوم اور ایک ملّت ہو۔ تمہارا کسی دوسری قوم میں جذب ہونا سراسر ایک باطل نظریہ ہے ——— اگر اقبال نے بروقت یہ اقدام نہ کیا ہوتا اور اسلامی قومیت کے صحیح تصور کی تبلیغ کر کے مسلمانوں کے اندر اپنی اسلامی قومیت کا احساس پیدا نہ کر دیا ہوتا تو آج پاکستان کا کہیں وجود نہ ہوتا۔

آج اگر ہندوستان میں مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے اپنے تہذیبی وجود پر اصرار کر رہے ہیں تو وہ بھی اسی تعلیم کی وجہ سے کر رہے ہیں جو اقبال نے اس وقت دی تھی، اور یہ پاکستان بھی اسی تعلیم کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا جس نے مسلمانوں میں اس احساس کو بیدار کر دیا کہ وہ ایک قوم اور ایک ملت ہیں۔

دین و سیاست کے متعلق باطل تصوّر کی بیخ کنی

اقبال نے ایک بڑا کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ دین اور سیاست کی علیحدگی اور دنیا و دین کی تفریق کا جو تصور مغرب سے آکر مسلمانوں میں پھیل رہا تھا اور جس کی وجہ سے لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اہلِ دین کو سیاست سے کیا تعلق اور دین کو سیاست میں گھسیٹنے کا کیا کام، اقبال نے اس باطل تصور کا ٹھیک وقت پر مقابلہ کیا۔ اس نے دینِ بے سیاست کی بھی برملا مذمت کی اور سیاستِ بے دین کو بھی علانیہ مذموم قرار دیا۔ سیاستِ بے دین کے متعلق اقبال کا ایک مصرع ایسا ہے کہ اس موضوع پر تمام دنیا کا لٹریچر ایک طرف اور وہ مصرع ایک طرف ——— ان کا کہنا ہے کہ۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اگر آپ اس موضوع پر دنیا بھر کی کتابیں پڑھ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس مصرع میں

ان سب کا خلاصہ اور عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ اقبال نے ان الفاظ سے در اصل یہ بات ذہن نشین کی ہے کہ جب تم سیاست کو دین سے الگ کرتے ہو تو اس کا نتیجہ سوائے وحشت و بربریت اور ظلم و ستم کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ سیاست صرف اسی صورت میں ٹھیک رہ سکتی ہے جب کہ دین اس کو صحیح راستے پر قائم رکھنے کے لیے ایک رہنما قوت کی حیثیت سے اس کے ساتھ موجود ہو۔

اسی طرح سے مسلمانوں کے دماغوں میں جو یہ خیال جاگزیں ہو چکا تھا کہ اہل دین کا کام تو بس اللہ اللہ کرنا ہے یا مسجدوں اور مدرسوں میں فقط قرآن وحدیث پڑھنا ہے، ان کا سیاست سے بھلا کیا تعلق ---------- اس غلط تصور پر بھی اقبال نے ایک کاری ضرب لگائی ہے اور اس کو بھی ایک مصرع میں بیان کر دیا اور واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر جتنا کچھ لکھا جا سکتا ہے وہ سب ایک طرف اور وہ مصرع ایک طرف --------- اقبال کہتا ہے کہ۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اس ایک مصرع میں یہ سب حقیقت کھول دی گئی ہے کہ اگر دین کے پاس اپنے عقیدے اور نظام کو نافذ کرنے کے لیے طاقت نہیں ہے تو طاقت جس شخص یا گروہ یا نظام کے پاس ہے وہ دنیا کو اپنے راستے پر ہانک کر لے جائے گا، آپ کے لیے کلیمی کرنے کا کیا موقع باقی رہے گا، اور وہ کلیمی کہاں بروئے عمل آئے گی۔

اقبالؒ نے پورے زور کے ساتھ یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کی کہ موجودہ زمانے کے ازم انسانیت کے دکھوں کا مداوا نہیں ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں جتنا ظلم و ستم، فساد و غارت گری اور انسانیت کے لیے آلام و مصائب رونما ہوئے ہیں وہ سب انہی ازموں کا کیا دھرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے جس طرح ان ازموں میں سے سرمایہ داری کی مذمت کی ہے اسی طرح سے اس نے اشتراکیت کی بھی مذمت کی ہے۔ ان کا آخری پیغام جو انہوں نے اپنی وفات سے دو ڈھائی مہینے پہلے آل انڈیا ریڈیو سے دیا تھا اور غالباً" ان کو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ یہ آخری پیغام دنیا کو دے رہے ہیں۔ اس میں انہوں نے بالکل وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ وہ اس وقت انسانیت جن مصائب میں گرفتار ہے اور جس ہلاکت و تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے وہ سب ان ازموں کی وجہ سے ہے۔ ان کے اس پیغام پر مشکل سے دو سال گزرے تھے کہ وہ تباہی جنگِ دوم کی صورت میں دنیا پر مسلط ہوئی اور اس کے بعد بھی اس کا خطرہ مستقل طور پر موجود ہے۔ انہوں نے وضاحت کے ساتھ یہ بتایا تھا کہ انسانوں کے یہ خود تراشیدہ ماڈرن ازم ہی

در اصل انسان کے مصائب کا سرچشمہ ہیں اور انہی ازموں نے اس وقت انسانیت کو معیشت عظمیٰ میں مبتلا کیا ہے اور اس کے لیے تباہی اور ہلاکت کی راہیں ہموار کی ہیں۔ انہوں نے اپنے اس پیغام میں اشتراکیت' سرمایہ داری' ملوکیت' آمریت' نازیت' ... طائیت سبھی کی مذمت بھی کی ہے اور انہیں انسانیت کے لیے مہلک قرار دیا ہے۔

اس کے ساتھ اقبالؒ نے مثبت طور پر یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کی ہے کہ تمہاری مصیبتوں اور مسائل کا اگر کوئی حل ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ تم قرآن کی پیروی کرو' اور اپنی زندگیوں پر اسلام کے آئین کو نافذ کرو۔ انہوں نے ۱۹۳۷ء میں قائد اعظمؒ کے نام جو خط لکھا تھا اس میں واضح طور پر یہ بتایا تھا کہ مسلمانوں کے معاشی مسائل کا اگر کوئی حل ہے تو وہ صرف اسلامی آئین کے نفاذ میں مضمر ہے۔

یہ وہ کارنامہ تھا جو اقبال نے اپنی زندگی میں انجام دیا۔

(ماخوذ (۱) رسالہ "جوہر" دہلی' اقبال نمبر ۱۹۳۸ء - (۲) ہفت روزہ "آئین" لاہور)

بقیہ: رسائل و مسائل

ایسی صورت میں عہد اطاعت کی عمداً خلاف ورزی کرنا' بہرحال ایسا گناہ اور کمزوری ضرور ہے کہ اس سے استغفار بھی کیا جائے اور صدقہ بھی دیا جائے۔ اور دوسری نیکیاں بھی کی جائیں کہ "اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ" "نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں" کا قرآنی اصول اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اس گناہ کے بارہ میں متعین طور پر نص وارد نہیں ہے کہ بطور کفارہ صدقہ دیا جائے۔ اسی لیے امیر جب مناسب سمجھے کہ عہد کی خلاف ورزی کرنے والے کو صدقہ یا کسی اور نیکی کا حکم دینا چاہیے تو وہ ایسا کر سکتا ہے لیکن اسے نظام کفارہ کا نام دینے کے بجائے "نظام صدقات و حسنات" کا نام دینا زیادہ بہتر ہے۔ مقصد بھی حاصل ہو جائے گا اور تعبیر پر کوئی اشکال بھی نہیں ہو گا۔ واللہ اعلم۔